عبید اللہ فراہی

عقائد و شرائع میں نظم کے بعض پہلو

فکر فراہی کی روشنی میں

مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام مکمل نظام حیات ہے، لیکن اس سے بالعموم ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اسلام زندگی کے ہر معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لیے کوئی نہ کوئی حکم رکھتا ہے، یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کے احکام جو تمام گوشہ ہائے حیات پر محیط ہیں ان میں باہم کوئی نظم و توافق ہے جس کی وجہ سے اس پر ایک نظام کا اطلاق ہو سکے۔ چنانچہ دین کو کچھ اس طور پر سمجھا اور پیش کیا جاتا ہے کہ وہ متفرق احکام اور مختلف قسم کی ہدایات کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے جس کا ہر جزو گویا دوسرے سے الگ ہے اور ان میں کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایمانیات اور عقائد جیسے اہم گوشہ میں بھی اسی بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ عقیدۂ توحید میں بھی اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات کے متعلق ہمارا رویہ انھیں کچھ متفرق ہی سمجھنے کا رہا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی صفات جن کی معرفت پر دین کی بنیاد ہے اور جس کے بغیر اسلام کا صحیح اور مکمل تصور قائم نہیں ہو سکتا ان میں ربط اور مناسبت معلوم کرنے کو اہمیت نہیں دی گئی تو دین و شریعت کے دیگر امور میں ربط و نظام دینے کا خیال کہاں سے آتا۔ حالانکہ ایسا نہ کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بعض کے مغایر ہو گئیں اور اس کی طرف کذب، اضلال، تعذیب بلا ذنب اور انعام بغیر حق جیسی باتیں منسوب کر دی گئیں اور دین کا ہر گوشہ اس سے متاثر ہو گیا۔[1] چنانچہ یہ بات خارج از امکان نہیں کہ عقائد و شرائع کے متعلق جامع تصور نہ ہونے کی وجہ

---

[1] اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: "وهذا الاصل دخل فی جميع ابواب الدين۔ اصوله وفروعه فی خلق الرب لما يخلقه ورزقه واعطاءه ومنعه وسائر ما يفعله تبارك وتعالىٰ، ودخل فی امره ونهيه وجميع ما يأمره به وينهىٰ عنه ودخل فی المعاد۔ فعندهم يجوز ان يعذب الله جميع أهل العدل والصلاح والدين والانبياء والمرسلين بالعذاب الأبدی وأن ينعم جميع اهل الكذب والظلم والفواحش بالنعيم الأبدی"۔ کتاب النبوات، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ ۱۳۴۶ھ، ص ۹۸

سے دین کے حقائق اور اس کے مقصود سے ہم کما حقہ واقف نہ ہو سکے ہوں اور اس وجہ سے ہمارے نظام حیات میں نقص رہ گیا ہو۔

آئندہ سطور میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ، جو نظم قرآن کے داعی اور مبلغ بلکہ معلم کی حیثیت سے معروف ہیں اور جنھوں نے قرآن مجید میں نظم کے حوالہ سے پورے دین کے نظام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے،[1] ان کے اس سے متعلق اشارات کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے۔

کسی چیز کے نظام کو سمجھنے کے لیے اس کے عناصر یا اجزا میں ترتیب و ترکیب کو جاننا اور ان کے مرکز جامع یا انھیں باہم مربوط اور زندہ و متحرک رکھنے والی قوت یعنی اس کی روح کو معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دین کی حد تک یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے۔ اگر ان دونوں کی اصل کا اعتبار کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ دین نام ہے علم کے پہلو سے ایمان باللہ اور معرفت الٰہی کا اور عمل کے پہلو سے اس کی بندگی اور اطاعت کا۔ اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں بلکہ ثانی الذکر اول الذکر کی تفصیل ہے۔[2]

---

[1] قرآن مجید چونکہ عقائد و شرائع یعنی ایمان اور اسلام کی بنیاد ہے اس لیے دین کے نظام کو سمجھنے کے لیے اس پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور جب قرآن محل تدبر ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ دین کی حکمت اور اس کے نظام کی طرف بھی رہنمائی ہوگی۔ اس ضمن میں مولانا فراہیؒ نے سورۂ شوریٰ کی آیت (۵۲) کو بطور اصل کے پیش کیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے: "وكذٰلك أوحينا اليك روحًا من امرنا ماكنت تدری ما الكتاب ولا الايمان ولكن جعلناه نورًا نهدی به من نشاء من عبادنا وانك لتهدی الیٰ صراط مستقيم"۔ ملاحظہ ہو دلائل النظام مشمولہ "رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن" الدائرۃ الحمیدیۃ بمدرسۃ الاصلاح سرای میر اعظم کرہ سنۃ ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء، المجموعۃ الاولیٰ، ص ۷۶۔ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں کہ "استاذ امام یہاں ایمان سے حکمت مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان: قول، عمل اور حال تینوں کا مجموعہ ہے اور یہی حقیقت حکمت کی بھی ہے"۔ تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء، ۶/۱۹۵۔ مولانا فراہیؒ نے ایمان کو حکمت کا دوسرا نام بتایا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حکمت قرآن، ترجمہ خالد مسعود، بحوالہ ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، جلد ۳، جنوری۔ دسمبر ۱۹۸۸ء، قسط اول، ص ۲۰-۲۲

[2] اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ والعصر، ترجمہ تفسیر نظام القرآن، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۰ء، ص ۳۴۹۔

معرفتِ الٰہی

جب فہم دین کی شرط معرفت الٰہی ٹھہری اور تمام اعمال کا انحصار اس پر ہوا تو یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے آپ سے آپ ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا فراہی فرماتے ہیں:

"ایمان باللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی تین صفاتِ کمال: رحمت، قدرت اور حکمت پر ایمان لانا ہے۔ ان تینوں صفات کے دائرہ میں دوسری تمام صفات جلال وصفات جمال داخل ہیں۔"[1]

آگے فرماتے ہیں:

"جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان تین صفاتِ کمال پر ایمان لاتا ہے اس کو ایمان باللہ کے باقی ارکان کی ہدایت بھی حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے:
من یؤمن باللہ یھد قلبہ"[2] (تغابن ۱۱)

تمام صفات میں سے انھیں تین کو مولانا نے کیوں منتخب کیا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان اور دیگر تمام مخلوقات بلکہ پوری کائنات کی تخلیق اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا جاری رہنا جس کی وجہ سے ہر شے میں حیات اور نمو ہے اور ہر ایک کی پرورش و پرداخت یا ان کی منفعت کے الگ الگ سامان مہیا ہیں سب ایک بے عیب، مکمل اور عجیب و غریب حساب اور اندازہ کے مطابق معلوم ہوتے ہیں اور یہ سارا محیر العقول نظام ایک حکیم، قادر اور رحیم ہستی پر دلالت کرتا دکھائی دیتا ہے۔[3]

---

[1] حکمت قرآن، شمولہ ششماہی علوم القرآن، جلد ۵، جنوری۔جون ۱۹۹۰ء، قسط چہارم، ص ۱۸

[2] ایضاً، قسط چہارم، ص ۱۸

[3] امام ابن تیمیہ نے سورۂ علق کی ابتدائی آیات کی روشنی میں انسان کی تخلیق ہدایت اور مختلف علوم سے اس کے بہرہ ور ہونے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی انھیں تین صفات کا ذکر کیا فرماتے ہیں: "وفی ذٰلک من بیان قدرتہ وحکمتہ ورحمتہ" کتاب النبوات، ص ۱۶۵۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "فقد تبین ثبوت حکمتہ من جھۃ علمہ ومن جھۃ نفس افعالہ المتقنۃ والمحکمۃ" ایضاً ص ۲۲۶۔

چنانچہ مولانا ملاحدہ پر نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لکل امر ذی حکمۃ وتدبیر ومنافع لابد من مرید، حکیم، قادر، رحیم۔"[1]

اللہ تعالیٰ کا قادر و رحیم ہونا تو بالکل واضح ہے لیکن موجودات اور ان کے امور کے اندر اس کی حکمت کا ہونا ایک مخفی امر ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ وخضر سے متعلق واقعہ سے ظاہر ہے۔ یہاں اس پر بحث مقصود نہیں ہے، بلکہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ بغیر حکمت کے نہ کوئی نظام قائم ہو سکتا ہے اور نہ باقی رہ سکتا ہے۔ نظام عالم کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ:

"کائنات فطرت کی ہر شے ایک اندازہ کے مطابق اور توازن کے ساتھ برقرار ہے۔ پھر نفع و آرام کے مقصد سے ان میں توافق بھی ہے اور ان میں توافق کا پایا جانا ایک ذات حکیم پر دلیل ہے۔"[2]

نیز فرماتے ہیں کہ:

"ثم ھٰذا الحکمۃ راجعۃ الی توحد العالم ینظم بعضھا ببعض۔"[3]

یہ تینوں صفاتِ کمال۔ رحمت، قدرت اور حکمت۔ جو بظاہر الگ الگ معلوم ہوتی ہیں

---

[1] عیون العقائد، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء، ص ۲۹

[2] ایضاً، ص ۳۰

[3] ایضاً، ص ۲۹۔ اس کی تفصیل ایک جگہ اس طرح کی ہے: "حکمت کی تعبیر اس اساس پر ہوتی ہے کہ ہستی کے مختلف اجزاء کے درمیان موافقت کی نوعیت معلوم ہو۔ یہ علم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ کائنات کے نظام کو نہ سمجھا جائے اور یہ نظام اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ اس کے تمام اجزاء ایک ہی نظام کے اجزاء ہیں"۔ اس بات کو انھوں نے ایک جملہ کی معنویت سے واضح کیا ہے کہ "آپ ایک جملہ کے ہر جزو کا موقع ومحل اور تمام اجزاء کی باہمی نسبت جانے بغیر جملہ کے معنی نہیں سمجھ سکتے"۔ ملاحظہ ہو حکمت قرآن، ششماہی علوم قرآن جلد ۴، جولائی۔دسمبر ۱۹۸۹ء، قسط سوم ص ۱۵۔

مولانا کی نظر میں ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ "حکمت قدرت کاملہ کا نتیجہ ہے اور اس کی بنیاد رحمت ہے"[1]۔ اس کی توضیح مزید ایک جگہ ان الفاظ میں ہے:

"باری تعالیٰ کی پہچان کے لیے صرف اس کی صفات قدرت وصنعت پر انحصار کیا جائے تو یہ شرک کی نفی تو کر دیتی ہے اور مزید غور و فکر پر اُبھارتی ہے لیکن آدمی جب تک صفاتِ ربوبیت و رحمت کا ادراک نہیں کرتا وہ دین تک نہیں پہنچ پاتا کیوں کہ یہ وہ صفات ہیں (یعنی رحمت اور اس سے متعلق صفات) جو غایت کی حیثیت رکھتی ہیں اور صفات حکمت و قدرت انھیں کی خاطر ہیں"[2]۔

یہی وجہ ہے کہ "رحمت" کو اللہ تعالیٰ نے اپنی غالب صفت بتایا ہے "ورحمتی وسعت کل شيءٍ"[3]۔ یعنی اس کی رحمت ہر چیز پر مقدم ہے اور بنیادی طور پر سب کے لیے عام ہے[4]۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی یہ صفت اتنی محبوب ہے کہ اسے اپنے نام کے بدل کے طور پر استعمال کیا اور اسے اپنے اوپر خود ہی لازم ٹھہرا لیا "کتب ربکم علی نفسه الرحمة"[5]۔ جب یہ ہے تو دیگر تمام صفات اسی کو شامل ہونی چاہئیں۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

"رحمتِ کاملہ ہی غنارِ تام ہے اور اسی کا نام قدرتِ کاملہ ہے۔ چنانچہ رحمت وہ صفت ہے جو قدرت، حکمت اور خلق و عدل سب کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہے اور جملہ صفات کا مرکز ہے۔ باری تعالیٰ کو رحمٰن کہو یا اللہ دونوں میں کوئی فرق نہیں"[6]۔

اور یہ جو رحمت کے مقابل اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی صفات آتی ہیں تو انھیں بھی مولانا نے رحمت ہی پر مبنی ٹھہرایا ہے اور اس کو دو پہلوؤں سے ثابت کیا ہے: ایک تو خود رحمت ہی کی حفاظت

---

[1] عیون العقائد، ص ۳۶

[2] حکمت قرآن، قسط چہارم، ص ۱۹-۲۰۔ اس بات پر یہ آیت دلیل ہو سکتی ہے "مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (فاطر ۲)

[3] سورۂ اعراف - ۱۵۶ [4] ملاحظہ ہو عیون العقائد، ص ۶۳

[5] سورۂ انعام - ۵۴ [6] عیون العقائد، ص ۳۶

وصیانت اور اس کے نفاذ میں موانع کو دور کرنے کے لیے جیسا کہ ہم فطری طور پر کسی کے اوپر ظلم ہوتے دیکھ کر غیظ و غضب میں آجاتے ہیں اور مظلوم کے ساتھ رحم دلی اور ہمدردی کی وجہ سے اس کی مدافعت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ "غضب" کا تعلق غیرت سے ہے اور غیرت عزّت کی سرشت میں پائی جاتی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے[1]۔ چنانچہ جو شے دل کو جس قدر عزیز ہوتی ہے اس کے لیے اسی درجہ کا جذبۂ غیرت و حمیت بھڑکتا ہے[2]۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو حق[3] عزیز و محبوب ہے اس وجہ سے کہ اس نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا[4]، اس لیے جو لوگ حق کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے[5]۔ اس حقیقت کو مولانا نے فطرت انسانی میں اس کے وجود سے ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"نعلم من فطرتنا انما نغضب علی من يبطل العدل ويكذب بالحق وينتهك الحرمات ويهضم الارامل واليتامى"[6]۔

نیز فرماتے ہیں کہ:

"جو شے تم کو عزیز و محبوب ہو گی کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت

---

[1] عیون العقائد، ص ۶۵ [2] تفسیر سورۂ والعصر، ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۵۶

[3] "حق" اسم ذات ہے اور یہ اسم صفت اور فعل ہر اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ مولانا نے سورۂ والعصر کی تفسیر میں حق کے بنیادی معنی اور اس سے نکلے ہوئے مفاہیم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے ایک خاص معنی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حق کے خاص معنی مواسات و ہمدردی کے ہیں۔ اس کے لیے دوسرا معروف لفظ "مرحمة" ہے"۔ اس مفہوم کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کلام عرب سے شواہد پیش کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ اس سورہ میں "وتواصو بالحق" بالکل اسی طرح آیا ہے جیسے سورہ بلد (۱۷) میں "وتواصو بالمرحمة"۔ تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر سورۂ والعصر، ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۴۴-۳۴۵ نیز ص ۳۵۴-۳۶۲

[4] مولانا فرماتے ہیں کہ حق سے مراد حکمت و عدل ہے، ترجمہ تفسیر ص ۳۵۸۔ حکمت اور عدل بظاہر دو الگ الگ چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن حکمت عدل کے اندر پنہاں ہوتی ہے کیونکہ "حکمت" نام ہے حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والی قوت کا۔ ملاحظہ ہو "الحکم والحکمة" مفردات القرآن للفراہی، تحقیق ڈاکٹر محمد اجمل۔

[5] تفسیر سورہ والعصر ص ۳۵۶ [6] عیون العقائد، ص ۶۵

کروگے۔ اس کی حمایت کے لیے تمھاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی۔"[1]

غضب اور انتقام ایسی چیز نہیں جو شروع سے ہو۔ اس کے برعکس رحمت آغاز سے انجام تک ہے۔ غضب و انتقام کا ظہور خلاف حق اعمال کے بعد عدل اور قسط کی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں: فالرحمة السابقة لاتزاحم معها واما بعد الأعمال فتزاحمها الضرورة العدل والقسط فان الله تعالیٰ هوالحق ولذلك يبطل الباطل ويحق الحق ولايحكم الابالقسط۔[2] یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انتقام کا ذکر اپنے کلمہ، اپنے امر اور اپنی سنّت کے خلاف انسانی اعمال و افعال کے ضمن میں انجام کار کے طور پر کرتا ہے کیونکہ یہی تقاضائے عدل ہے اور اسی سے حق کا قیام ہے۔ اگر کوئی شخص حق کے خلاف باطل کے ذریعہ جدال سے اس کے انتقام کو دعوت دیتا ہے تو لازم ہے کہ اس کے اوپر کلمۂ حق یا امرِ الٰہی بتقاضائے عدل و قسط نافذ ہو[3] جیسا کہ فرمایا: "وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ النَّارِ"[4] (اور باطل کے ذریعہ انھوں نے جدال کیا تاکہ اس سے حق کو پسپا کر دیں۔ سو ہم نے ان کو پکڑ لیا، دیکھو کیسی رہی میری پکڑ اور عقوبت! اور ایسے ہی پوری ہو چکی ہے تیرے رب کی بات ان لوگوں پر جنھوں نے کفر کیا ہے۔ یہ دوزخ میں جانے والے لوگ ہیں)، اس لیے اللہ تعالیٰ کے غضب کی نفی درحقیقت اس کی رحمت کی نفی ہے۔[5]

رسالت اور معاد

جس طرح حقیقت توحید تک پہنچنے کے لیے مولانا نے اللہ تعالیٰ کی تین صفات پر ایمان لانے کی بات کہی اسی طرح رسالت اور معاد پر ایمان لانے کے لیے بھی انھوں نے انھیں تین صفات الٰہی کا ذکر کیا اور رسالت اور معاد پر ایمان لانے کو ایمان باللہ کا لازمی نتیجہ قرار دیا، جیسا کہ فرماتے ہیں:

" رسالت اور معاد پر ایمان لانا ایک ایسے خدا پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ ہے

---

[1] تفسیر سورۂ والعصر، ص ۳۵۶ [2] عیون العقائد، ص ۶۴۔ [3] ایضاً، ص ۶۴

[4] سورۂ مومن ۵۔۶ [5] عیون العقائد، ص ۶۵

جس کو واحد، مہربان اور قادر و حکیم مانا گیا ہے۔"[1]

اور معاد پر ایمان لانے کا مطلب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

" الايمان بالمعاد هو ايمان بصفة العدل والحكمة والرحمة والربوبية والقدرة الكاملة لله تعالیٰ۔"[2]

اور معاد کے انکار کا مطلب یہ بتایا کہ یہ خدا اور اس کی صفات کا انکار ہے[3] اور چونکہ ایمان بالآخرة پر دین و شریعت کی اساس ہے اس لیے اس کا انکار خدا اور اس کے رسولؐ کا انکار ہے۔[4]

مولانا نے رسالت کو معاد پر مبنی ٹھہرایا ہے، اس اعتبار سے کہ پیغمبر مبشر اور نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ان کا بشیر اور نذیر ہونا عبارت ہے معاد کی خبر دینے سے۔[5] یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے معاد کو اپنی تعلیم کی اساس بنایا ہے اور ابتدا روحی میں زیادہ تر اسی کی طرف دعوت دی ہے اور توحید و معاد دونوں کی تعلیم کو ایک ساتھ جوڑ دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دونوں کا ذکر اکثر ساتھ ساتھ آتا ہے۔[6] رہی نبوت تو یہ انھیں دونوں کی تعلیم کے لیے ہے[7] بلکہ نبی کی تعلیم توحید اور جزاء سے شروع ہی ہوتی ہے۔[8] چنانچہ انبیاء علیہم السلام ابتداءِ امر میں اپنی نبوت کو نہیں ثابت کرتے بلکہ توحید اور معاد کو ثابت کرتے ہیں[9] اور ان کا ایسا کرنا خود ان کی اپنی نبوت کا اثبات ہوتا ہے۔

رسالت، توحید اور معاد کے بیچ میں واقع ہے۔ توحید کی طرف پیغمبر کی دعوت کا مطلب خدا کی رحمت کی طرف لے جانا ہے اور عذاب آخرت سے اس کے ڈرانے کا مقصد خدا کے غضب اور انتقام سے بچانا ہے۔ دنیا میں بھی جب تک پیغمبر اپنی قوم کے اندر ہوتا ہے اس پر عذاب نہیں آتا اور قوم امان میں رہتی ہے، " وما كان الله ليعذبهم وأنت فيهم"۔[10] اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر سورہ ذاریات، ترجمہ تفسیر نظام القرآن ص ۱۴۳-۱۴۴ [2] عیون العقائد، ص ۱۹۱

[3] ایضاً، ص ۱۹۱، [4] ایضاً، ص ۱۹۲ [5] ایضاً، ص ۱۹۱، [6] ایضاً، ص ۱۹۲

سورۂ انعام میں تینوں کے مضامین ساتھ ساتھ بیان ہوئے ہیں اور باہم دگر پیوستہ ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں کہ "هذه الامور أمر واحد" تفسیری حواشی، سورۂ انعام۔

[7] تفسیری حواشی، سورۂ انعام [8] عیون العقائد، ص ۱۲۵، [9] ایضاً، ص ۱۶۹ [10] انفال ۳۳

"جب تک رسول قوم کے اندر رہتا ہے وہ قوم کے لیے سپر بنا رہتا ہے۔ اس لیے خدا کا قہر و غضب اس وقت تک نمودار نہیں ہوتا۔"[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی بعثت اور اس کا وجود سرتاپا رحمت ہے "وما ارسلناك الا رحمة للعالمين"[2]۔ یہی بات معاد کے متعلق بھی مولانا نے فرمائی کہ "اس کی غایت رحمت ہے"[3] کیونکہ قیامت کا واقع ہونا صالحین پر رحمت کے مقصد سے ہے[4]۔ رہا مجرمین پر عذاب کا معاملہ تو یہ مظلومین کی طرف سے انتقام کا تقاضا ہے۔ یعنی یہ مظلومین کا حق ہے کہ ان کی طرف سے انتقام لیا جائے اور یہی عدل و قسط ہے، کیونکہ نیکوکاروں اور مجرموں کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کرنا ناانصافی، ظلم اور خلاف حق و عدل ہے[5]۔ "أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ"[6]۔ معاد کے رحمت اور عدل و قسط ہونے پر مولانا نے قرآن مجید سے یہ آیات بطور دلیل پیش کی ہیں:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ[7]	تیرے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، وہ تم کو ضرور لے جائے گا جمع کر کے قیامت کے دن کی طرف۔
إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا	بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ

[1] تفسیر سورۂ کافرون، ترجمہ تفسیر ص ۴۷۲ [2]

[3] تفسیری حواشی، سورۂ انعام۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں "جزا کوئی ظلم اور ناانصافی نہیں ہے۔ یہ بھی ظہور رحمت ہی کا ایک بھیس ہے، بلکہ اس سے جو رحمت ظہور میں آتی ہے وہ بالکل کامل ہوتی ہے۔ پس جزا کی اصل بنیاد بھی رحمت ہی ہے اور اس کے نتائج و ثمرات بھی رحمت ہیں"، تفسیر سورہ والتین، ترجمہ تفسیر ص ۳۲۸، چنانچہ قرآن مجید میں جس طرح خدا کی صفت قدرت کے ساتھ معاد کا ذکر آتا ہے جیسا کہ فرمایا "فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ" (یٰس ۸۳) اسی طرح آثار رحمت کے بیان کے ساتھ قیامت کا ذکر آتا ہے جیسا کہ فرمایا: "وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ" (ذاریات ۔ ۲۲) [4] عیون العقائد، ص ۱۹۳

[5] عیون العقائد، ص ۱۹۳ [6] سورۂ قلم ۳۵-۳۶ [7] انعام ۱۲

الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ[1]	ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے۔ اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے ان کے کفر کی پاداش میں کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے۔

اور رسالت کا عدل و قسط ہونا شہادت اور اتمام حجت کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ پیغمبر اپنے رب کی طرف سے جو کچھ جانتا، دیکھتا اور سنتا ہے اسے بے کم و کاست اپنی قوم تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح وہ امر معلوم و مشہود کی شہادت دیتا ہے۔ گویا پیغام رسالت کے پہنچانے کا جو فرض اس پر حق واجب کی طرح عائد تھا اس نے اسے ادا کر دیا۔ دوسرے اس کے علم اور مشاہدہ سے جو بات اس پر واضح اور بین ہوتی ہے اس کی شہادت دلائل و براہین اور اپنے عمل سے دے کر اس کی تصدیق کر دیتا ہے جس سے اس کی قوم پر حجت قائم ہوتی ہے۔ اسی لیے پیغمبر کو شہید کہا گیا ہے[2] اور اہل ایمان کو بھی شہادت کا حکم ہوا جیسا کہ فرمایا:

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا[3]	تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ[4]	اے ایمان والو! حق کی شہادت دینے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی گواہی دیتے ہوئے۔
كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ[5]	حق پر قائم رہو اللہ کے لیے اس کی شہادت ہوئے۔

جس طرح انفس و آفاق کی شہادت توحید اور معاد پر ہے اسی طرح پیغمبر کی شہادت بھی دونوں پر ہے۔ شہادت اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے۔ یہ شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے متعلق یہ

[1] یونس ۴، [2] تفصیل کے ملاحظہ ہو مولانا فراہی کی تصنیف مفردات القرآن میں لفظ "شہید"، تحقیق ڈاکٹر محمد اجمل

[3] سورہ بقرہ ۱۴۳، [4] سورہ مائدہ ۸، [5] سورہ نساء ۱۳۵

کہہ دی کہ:

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهٗ لَآ اِلٰـهَ اِلَّاهُوَ وَالْمَلٰۤئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢبِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّاهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔[1]

اللہ کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، فرشتے اور اہلِ علم بھی اس کے گواہ ہیں وہ حق وعدل کو قائم رکھنے والا ہے۔ کوئی معبود نہیں سوا اس کے جو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور اپنے قائم بالقسط ہونے کو اپنی صفت عزیز وحکیم سے متعلق کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل ربوبیت کے اوصاف کا مرکز ہے[2]۔ جب ربوبیت، معاد اور پورے نظام کائنات کا محور عدل ہے تو لازم ہے کہ پیغمبر بھی عدل کی شاہراہ (صراط مستقیم) پر قائم ہوں اور یہی ان کا دین خالص اور دین قیم ہو[3] جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنے کا حکم دیا:

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰانِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔[4]

کہہ دو میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھے راستہ کی طرف کردی ہے۔ دینِ صحیح، ملت ابراہیم کی طرف جو یکسو تھے۔

چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ دین کے نظام کی بنیاد عدل ہے[5]۔ اسی بات کو امام ابن تیمیہؒ نے دو ٹوک انداز میں اس طرح کہا ہے:

---

[1] العمران ۱۸، [2] اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں: واعلم أن العدل كما أنه محور لتفاصيل افعال العبودية فكذلك هو محور لتفاصيل اوصاف الربوبية.... ولولا العدل لتزاحم بعضها بعضا وهكذا فيما خلق، وانما بقاء كل ذلك بالعدل، تفسیری حواشی سورہ فاتحہ۔ [3] مولانا فرماتے ہیں کہ "صراط مستقیم" ہی دین قیم اور دین خالص ہے جو بندہ کو اس کے رب تک پہنچاتا ہے، تفسیری حواشی سورہ فاتحہ۔ اور وہ راستہ شریعت کا راستہ ہے، تفسیر سورۃ الفاتحہ، مطبعۃ اصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ ۱۳۵۷ھ، حاشیہ ص ۴۶۔ اس لفظ کے وسیع معنی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے فرماتے ہیں کہ اسلام، دین فطرت، توحید اور صراط مستقیم ایک ہی شے کی مختلف تعبیریں ہیں، تفسیری حواشی سورہ انعام۔ [4] سورہ انعام ۱۶۱، [5] حکمت قرآن قسط چہارم، ص ۲۱

"والمقصود هنا أن ما جاء به الرسول يدل عليه السمع والعقل وهو حق فى نفسه كالحكم الذى يحكم به فانه يحكم بالعدل وهو الشرع فالعدل هو الشرع، والشرع هو العدل. ولهذا يأمر نبيه أن يحكم بالقسط وأن يحكم بما انزل الله. والذى انزل الله هو القسط، والقسط هو الذى انزل الله"[1]

شریعت جس طرح عدل پر مبنی ہے اسی طرح رحمت پر بھی ہے، بلکہ عدل جیسا کہ پہلے گذرا دائرۂ رحمت کے اندر ہے کیونکہ عدل ایفاء حق کا نام ہے[2] اور رحمت ایفاء حق سے بڑھ کر ہے۔ رہا شریعت کا مبنی بر حکمت ہونا تو یہ دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ شریعت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور حکم جب خدا کی طرف سے ہو تو ممکن نہیں کہ وہ خالی از حکمت ہو، کیونکہ دونوں کی اصل ایک ہے چنانچہ حکمت ہی کی طرح حکم کا اطلاق بھی ایسے قول پر ہوتا ہے جو علم کے مطابق حق اور واضح فیصلہ پر مشتمل ہو۔ جیسا کہ ارشاد ہوا "وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَمَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ[3]" (اور اسی لیے ہم نے اتاری ہے یہ کتاب ایک قول فیصل کی حیثیت سے عربی زبان میں۔ اور اگر تم اس علم کے آجانے کے بعد چلے ان کی خواہشوں کے موافق تو نہ تمہارا کوئی اللہ کے مقابل مددگار نہ بچانے والا) دوسرا پہلو یہ ہے کہ شریعت سے اللہ تعالیٰ کا مقصود بندوں کی خیر وصلاح ہے اور حکمت کے اندر خیر وصلاح کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ "واما الصلاح فهو عبارة عن اثر الحكمة والعلم، فيشير الى العمل الصالح[4]" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شریعت اپنی اصل اور اپنے اثر دونوں کے لحاظ سے حکمت ہے جس کی غایت رحمت ہے۔

رحمت تمام

انسان کو صفات الٰہی کا مظہر اتم کہا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے اندر ایسے اوصاف رکھتا ہے جو خدا کی صفات کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ اسے علم، قدرت، حیات اور دوسری بہت سی نعمتیں ملی ہیں۔

---

[1] کتاب النبوات، ص ۱۴۶۔ [2] تفسیری حواشی سورہ نحل۔ [3] سورہ رعد ۳۷، دیکھیے مفردات القرآن میں "الحکم والحکمۃ"۔ [4] ایضاً "الحکم والحکمۃ والصالح"۔

اس کے اندر رحم دلی اور غصہ ہے اور وہ فطری طور پر عدل وانصاف کو پسند کرتا ہے۔ یہ تمام خصوصیات جو اس میں ہیں اس زمین پر کسی نظام کو چلانے کے مقصد سے معلوم ہوتی ہیں چنانچہ انھیں اوصاف کی بنا پر وہ اپنے محدود اور مختصر دائرہ کے اندر زندگی کا ایک نظام قائم کرتا ہے۔ لیکن یہ نظام اسی وقت صحیح اور مکمل ہو سکتا ہے اور نظام کائنات سے اس کی مطابقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنے اوصاف کو اپنے خالق کے اوصاف کے موافق بنالے ورنہ جس منصب پر اسے فائز کیا گیا ہے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا کیے بغیر وہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی اس مخلوق کو درجۂ کمال تک پہنچائے تاکہ جس طرح وہ پورے عالم کے نظام کو چلاتا ہے اسی کے موافق اس کا بندہ اس زمینی نظام کو چلائے۔ انسان کی خلقت سے لے کر زمین وآسمان تک کا سارا اہتمام اسی بات کی شہادت دے رہا ہے۔ یہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم احسان اور سب سے بڑی رحمت ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ وہ تخلیق کرے۔ پھر رحمت کی تکمیل کے لیے اس نے نعمت کی تکمیل کی۔ رحمت کی تکمیل ہی کی خاطر یہ ضروری ہوا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو اس بات کی اہلیت رکھتی ہو کہ اس پر نعمت تمام کی جائے۔" [1]

آگے لکھتے ہیں:

"انسان پر نعمت کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اختیار اور اعلیٰ مراتب کے لیے رغبت کی صفات رکھیں۔ یہیں سے اس کے اندر شر، کج روی اور خواہشات نفسانی کے در آنے کی راہ ملی۔ ... اگر اختیار نہ ہوتا تو نعمت کی تکمیل نہ ہوتی اور اگر بندے گناہ نہ کرتے تو رحمت کی وسعت میں کسر رہ جاتی۔ لہٰذا انسان کو جو اختیار ملا ہے اس نے اس کو اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کا اہل بنایا ہے۔" [2]

نیز فرماتے ہیں کہ:

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ واختیار کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے

[1] حکمت قرآن، قسط چہارم، ص ۱۵۔ [2] ایضاً ص ۱۵، اس سلسلہ میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورہ والتین، ص ۳۲۸ - ۳۳۰

اس وجہ سے اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو ایک آزاد اور با اختیار مخلوق کے شایانِ شان ہے، یعنی اس سے اطاعت وبندگی کا عہد لیا۔ اس کو مجبور ومحکوم نہیں بنایا۔" [1]
لیکن انسان اپنی ابتدائے آفرینش کے اس عہد کو بھول جایا کرتا ہے، جیسا کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ ہوا۔ اس لیے اسے توبہ کے کلمات سکھلانے اور اس عہد کو یاد دلاتے رہنے کے لیے انتہائے رحمت اور وسعت مغفرت کے تقاضے سے انبیاء ورسل کتاب وشریعت کے ساتھ مبعوث کیے گئے تاکہ اسے جس درجۂ کمال (یعنی قربت الٰہی جس سے وہ دور ہوا) تک پہنچانا مقصود ہے وہ پورا ہو اور اس پر نعمت الٰہی کی تکمیل وتتمیم ہو، جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں:

"یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے خلق کا آغاز بھی رحمت سے کیا اور اختتام بھی اسی پر رکھا چنانچہ انسان کو نعمتوں سے سرفراز کیا اور اس پر رحمت کی تکمیل کی۔ اسی غرض کے لیے اس نے پیغمبر بھیجے اور انسانوں کی تربیت کی اور درجہ بدرجہ انھیں اوپر اٹھایا یہاں تک خاتم الرسل نبی امی حامل علم لدنی متمم کمال انسانی رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انھیں درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔" [2]

رحمت اور شریعت

جس طرح انسان کی زندگی اور نشو ونما اور اس کے قوائے جسمانی کے تغذیہ وتقویہ کے لیے عالم اسفل میں اسباب مہیا ہیں اسی طرح اس کے قوائے روحانی کی تربیت اور تغذیہ وتقویہ کے لیے عالم روحانی سے سامان آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مسیحؑ کی بیان کردہ ایک خوبصورت تمثیل مولانا نے نقل کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے" [3]۔ یعنی اس کے امر وحکم سے زندگی پاتا ہے، پس تمھاری زندگی اس کی شریعت کی پابندی میں ہے۔ [4] اس کی وضاحت دوسری جگہ اس طرح کی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے شریعت کو عالمین کے لیے رحمت بنایا ہے اور اس میں ان کی زندگی اور ترقی رکھ دی ہے۔ چنانچہ یہ بہترین نعمت اور بہترین رزق ہے۔" [5]

[1] تفسیر سورہ والتین، ص ۳۲۹ [2] عیون العقائد، ص ۱۱۳ - ۱۱۴
[3] متی باب ۴: ۴، [4] ترجمہ تفسیر سورہ فاتحہ ص ۸۶، [5] عیون العقائد ص ۱۱۴

شریعت کے رحمت ہونے پر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

قال یاقوم أرأیتم إن کنت علیٰ بینة من ربی و آتانی منه رحمة فمن ینصرنی من الله ان عصیته ۔ فما تزیدوننی غیر تخسیر" [1]	اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت سے مجھے نوازا ہے تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا؟ تم تو میری بربادی میں اضافہ ہی کروگے۔

اور اس کے بہترین رزق ہونے پر اس آیت سے:

قال یاقوم أرأیتم إن کنت علیٰ بینة من ربی و رزقنی منه رزقاً حسنا و ما أرید أن أخالفکم الیٰ ما انهاکم عنه [2]	اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے بہترین رزق دیا ہے، تو میں یہ نہیں چاہتا کہ خود وہی کرنے لگوں جس سے تمھیں روک رہا ہوں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"قرآن مجید اور کتب مقدسہ میں بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا دارومدار تمام تر رحمت اور مواساۃ پر ہے جو کہ تخلیق کی بنیاد ہے۔" [3]

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے نام اللہ اور رحمٰن و رحیم سے ہمیں واقف کرایا اور سورہ الحمد سے اپنی کتاب کا آغاز کیا۔[4]

خلاصۂ بحث اور مطالب عالیہ

اوپر کی ساری بحث یعنی اللہ تعالیٰ کی تینوں صفات کاملہ اور ان سے عقیدہ و شریعت

---

[1] سورہ ہود ۶۳، اس سورہ کی آیات ۱۷ اور ۲۸ میں بھی شریعت کو رحمت کہا گیا ہے۔
[2] سورہ ہود ۸۸، [3] عیون العقائد، ص ۱۱۰، [4] ایضاً، ص ۱۱۱

کے تعلق نیز رحمت کے اصل الاصول اور عدل کے ان سب کے محور ہونے کو اگر چند لفظوں میں سمیٹا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان کے اخلاق و اعمال پر ان کا کیا ترتب ہے، تو بات مولانا ہی کے بیان کے مطابق کچھ یوں ہوگی:

"عقیدۂ الوہیت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی صفت عزت و حکمت پر ہے (لا الٰہ الا ہو العزیز الحکیم)۔ صفت "عزت" کے ساتھ وحدانیت کا لزوم ہے اور صفت "حکمت" کے ساتھ انصاف اور یوم جزا کا۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ مخلوق کو مہلت ملے اور فوراً ان کی گرفت نہ ہو۔ اس طرح دیکھیے تو حکمت کی اساس رحمت ہے، کیونکہ حکمت ایسے عمل کو کہتے ہیں جو نیک انجام ہو، یا جس میں خیر مقصود ہو۔

چونکہ اللہ تعالیٰ ہر ضرورت سے بے نیاز ہے اس لیے اس نے مخلوق کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ ان پر رحم کرے۔ اسی رحمت کے پہلو سے حکمت کا لازمی تقاضا معاد ہے، اور اسی کے تحت اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف انبیاء و رسول اور داعی بھیجے۔

رحمت جس طرح "حکمت" کی اساس ہے اسی طرح صفت "عزت" کی بھی ہے کیونکہ شر اور ظلم کے لیے طاقت کا استعمال عزت کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

بندہ میں مرحمت کے وصف کا ہونا اس کے شکر کو مستلزم ہے جو منعم کی حق ادائی ہے۔ چنانچہ شکر بندہ کا پہلا فرض ہے، اور شکر ہی کے لحاظ سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ سب سے اعلیٰ نعمت یعنی حکمت اسے عطا کی جاتی ہے۔ رحمت، شکر اور حکمت میں مناسبت کی وجہ سے جیسا کہ ابھی واضح ہوا حکمت صرف رحم دل انسانوں کے لیے خاص ہے۔ اس لحاظ سے رحمت اصل الاصول ہے۔ رب کی صفات کی بھی اصل یہی ہے اور بندہ کی صفات کی بھی۔ پس مخلوق میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب رحم دل انسان ہوتے ہیں۔ یہی نماز کی اصل ہے جس طرح زکوٰۃ کی ہے۔ اور یہی توحید کی اساس ہے اور معاد، رسالت اور شریعت کی بھی۔ یہی معاملہ عدل کا ہے جو خدا اور بندہ دونوں کی صفات کا محور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا محور اس لحاظ سے کہ اس کی صفات کاملہ کا نظام اس پر ہے اور بندہ کی صفات کا محور اس اعتبار سے کہ یہ شکر کی بنیاد ہے جو کہ عبودیت کی جڑ ہے۔" (تفسیری حواشی سورہ آل عمران)

شکر

خدا کی بے پایاں رحمت اور بے شمار احسانات کے جواب میں انسان کے پاس پیش کرنے کے لیے اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ شکر ہے جس کا جذبہ فطری طور پر اس کے اندر سے اُبھرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں :

"اس نے خلق کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا جس سے خلق پر واجب ہوگیا کہ وہ خدا کی حمد کرے اور اس کا شکر بجالائے"[1]

کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اسی طرح بندہ کو چاہیئے کہ اپنے اوپر شکر کو واجب کرے ۔ گویا شکر ادا کرنا انسان کے اوپر ایک حق واجب ہے ۔ اسی لیے مولانا نے شکر کو عدل میں داخل بتایا ہے کیونکہ شکر کی ادائیگی کو واجب قرار دینا عدل کا تقاضا ہے[2] شکر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"شکر کا مفہوم امکان کی حد تک اور اگر کوتاہی ہو تو اس کے اعتراف کے ساتھ احسان کا بدلہ چکانا ہے"[3]

یا دوسرے لفظوں میں شکر احسان کے مساوی بدلہ کا نام ہے[4]

چونکہ شکر تقاضائے عدل ہے اور عدل انسان کی فطرت میں ہے اس لیے جذبۂ شکر کی طرف اپیل کے لیے مولانا نے بالکل فطری انداز اختیار کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

"آخر اس کا کیا جواز ہے کہ آپ تمام نعمتیں تو بلا معاوضہ حاصل کرلیں اور ان کے جس حق کی ذمہ داری آپ پر ہے اسے ادا نہ کرنا چاہیں"[5]

مولانا کے نزدیک نعمتوں کے حق ادا کرنے کا مطلب نعمت کو اس کا ٹھیک مقام دینا اور جس مقصد کے لیے وہ دی گئی اس مقصد میں اس کو استعمال کرنا ہے ۔ یہی نعمت کی قدر پہچاننا ہے جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے[6] اور یہ جذبہ مولانا کے بیان کے مطابق اگر عقل کی جانب سے ہو تو اس کی بصیرت اور قلب کی جانب سے ہو تو اس کی حیرت کی دلیل ہے[7] وجہ حیرت یہ کہ نعمتیں بے شمار اور اس کی رحمت لامتناہی ۔ کن کن چیزوں کا اور کس کس طرح شکر ادا کیا جائے ۔ دوسرے یہ کہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے نعمتوں میں افزونی ہوتی ہے" لئن شکرتم لازیدنکم[8]" جس سے مزید شکر لازم آتا ہے اور شکر مزید سے پھر نعمتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ اس سلسلہ کو جتنا بھی دراز کیجیے شکر واجب در واجب

---

[1] حکمت قرآن، قسط اول ص ۲۹، [2] ایضاً، قسط چہارم، ص ۲۱، [3] ایضاً ص ۲۳، [4] ایضاً ص ۲۳، [5] ایضاً ص ۲۱، [6] ایضاً، قسط اول، ص ۳۰، [7] ایضاً، قسط چہارم، ص ۲۲، [8] سورۂ ابراہیم ۷

ہوتا چلا جائے گا اور بات بالآخر اس کی رحمت پر جاکر ختم ہوگی ۔

چونکہ نعمتوں کے احساس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو کہ اولین معرفت ہے اس لیے یہ احساس اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ شکر ایمان کی اصل قرار پائے ۔ اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں :

"ایمان کی اصل شکر ہے اور اسی کے تحت تمام شریعت آجاتی ہے ۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت، حکمت اور قدرت کی نشانیوں کو دیکھتا ہے اور اپنے رب کو رحیم، حکیم، قادر، غالب اور عادل پاتا ہے تو اس کا شکر گزار اور حمد کرنے والا بن جاتا ہے ۔ اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور اس کی ناراضگی اور عذاب سے ڈرنے لگتا ہے ۔ اس وقت اس کا ایمان اور بندگی کامل ہوجاتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

ما یفعل اللہ بعذابکم	اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا
إن شکرتم و آمنتم و کان	اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور ایمان لاؤ ۔
اللہ شاکراً علیماً[1]	اللہ قدر داں اور علیم ہے ۔

اس آیت میں " آمنتم " سے پہلے " شکرتم " آیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شکر کا احساس ایمان پر مقدم ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ الحمد کو اپنی کتاب کا دیباچہ اور حمد کو نماز کی اصل اور شریعت اور اسلام کا مقدمۃ الباب بنا دیا ہے"[2]

شکر ایمان و اسلام اور عقائد و شرائع کی اصل کس طور پر ہے ؟ اس کے متعلق مولانا کا بیان ہے کہ شکر کے دو پہلو ہیں ایک نعمتوں کا ذکر اور منعم کی تعریف اور بڑائی ، دوسرے جو نعمتیں حاصل ہوں ان کی نذر اور قربانی ۔ پہلے پر نماز قائم ہے اور دوسرا تمام خیر و احسان اور انفاق کی بنیاد ہے ۔

---

[1] سورۂ نساء، ۱۴۷، [2] دلائل النظام ص ۴۷ ۔ سورۂ فاتحہ کے تحت اپنے تفسیری حواشی میں مولانا نے شکر کو شرائع و ایمان یعنی کتاب و حکمت یا دوسرے لفظوں میں پورے دین کا جامع کہا ہے اور اسے وحی و رسالت کی روح بتایا ہے ۔ اس طرح گویا توحید، معاد، نبوت، نماز و زکوٰۃ اور عبودیت تامہ یعنی عقائد و اعمال سب اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں ۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ " شکر جس طرح ایمان کی اصل ہے اسی طرح اسلام کی بھی ہے "

چنانچہ منع زکوٰۃ ایسے ہی کفر سے قریب ہے جیسے ترک صلوٰۃ۔ اس حقیقت کو تمام صحابہ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے سمجھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے توحید میں اخلاص اور مخلوق کے ساتھ احسان کی وصیت کے بعد فرمایا: ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں[1] اور جب ان سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے؟ تو فرمایا: "اپنے خدا کی اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انھیں دو حکموں پر تمام توریت اور تمام انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے[2]"، یعنی مخلوق کا اپنے خالق کی طرف محبت سے دیکھنا اور مخلوق کا مخلوق کی طرف محبت کی نظر سے دیکھنا۔ اول الذکر کو مولانا نے نماز کی حقیقت بتایا ہے، اور موخر الذکر تمام خیرات و احسان اور زکوٰۃ کی۔ چنانچہ نماز اور زکوٰۃ کے متعلق فرماتے ہیں کہ دونوں کی روح محبت ہے[3]۔

محبّت اور شکر

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دین کی حقیقت بھی محبت ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ رحمت چونکہ تمام صفات الٰہی پر مقدّم ہے اس لیے بندہ کی طرف سے اس کے مشابہ اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے تو وہ محبت کامل ہی ہوسکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل خالص ہو[4]۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

"جو شخص اپنی انتہائی وسعت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرسکتا وہ خدا کا شکر ادا کرنے والا نہیں ہے"۔[5]

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے محبّت کو دین کی حقیقت اور اس کی غایت کہا ہے[6] اور بتایا ہے کہ محبّت کی جان اخلاص ہے[7]۔ یعنی اخلاص نہیں تو محبّت بھی نہیں۔ اور محبت ہمیشہ صدق دل سے ہوتی ہے۔ یہی اخلاص ہے جس میں جھوٹ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

"اس میں جھوٹ کی ذرا آمیزش بھی زہر ہے[8]"؛ اس لیے کہ جھوٹ کا ذرا بھی شائبہ آیا اور اخلاص رخصت ہوا۔ جس طرح محبّت کے لیے خلوص ضروری ہے اسی طرح ایمان کے لیے بھی ضروری

---

[1] دیکھیے مرقس ۱۲: ۲۹-۳۱، [2] متی ۲۲: ۳۷-۴۰، تفصیل کے ملاحظہ ہو دلائل النظام ص ۴۷-۴۸
[3] مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص ۵۰، [4] ملاحظہ ہو حکمت قرآن، قسط چہارم ص ۲۳، [5] ایضاً ص ۲۳
[6] تفسیر سورہ اخلاص شمولہ تفسیر نظام القرآن، ص ۵۲۴، [7] ایضاً ص ۵۲۴، [8] ایضاً ص ۵۲۶

ہے کیونکہ ایمان اخلاص کا دوسرا نام ہے اور جس طرح محبّت کو اپنی بقا کے لیے ثبات چاہیے کیونکہ محبّت کا تقاضا ہے کہ شیٔ محبوب کے لیے آدمی کے اندر ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو[1] اسی طرح ایمان کو بھی اپنی بقا کے لیے ثبات و استحکام چاہیے۔ یہاں اس کی تفصیل نہیں بیان کرنا ہے بلکہ صرف یہ کہنا ہے کہ شکر چونکہ ایمان کی اصل ہے اس لیے ثبات کے پہلو سے اس کے ساتھ صبر ضروری ہے۔

صبر اور شکر

مولانا نے مختلف اجزاء دین سے صبر کے تعلق پر اس کے دین کے ایک بنیادی عنصر ہونے کی حیثیت سے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[2]۔ یہاں شکر کے ساتھ اس کے تعلق پر مولانا کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دونوں سے دین کا دائرہ کس طرح مکمل ہوتا ہے اور بالآخر کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"شکر کی حقیقت پر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ رب رحیم پر ایمان کی بنیاد ہے اور صبر کے متعلق غور کریں گے تو جان لیں گے کہ یہ یوم آخرت پر ایمان کی اساس ہے۔ یہ ایمان کے دو رُکن ہوئے، رہا تیسرا رُکن یعنی رسالت پر ایمان تو ایک پہلو سے یہ ہدایت اور رزق حسن دینے والے رب پر ایمان سے متعلق ہے اور دوسرے پہلو سے عادل و حکیم رب پر ایمان کے تحت آتا ہے"۔[3]

یہ تو شکر و صبر سے عقائد کا تعلق ہوا، رہا شرائع و اخلاق کا ان سے تعلق کا معاملہ تو اس کی تفصیل مولانا کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ:

"دین کے دو پہلو ہیں، اس کا ایک پہلو شکر سے متعلق ہے اور دوسرا صبر سے۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، خضوع، والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حُسن سلوک، قرابت داروں کا لحاظ و خیال اور ان کے حقوق کی ادائیگی نیز تمام بھلائی کے کام شکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور روزہ، جہاد، پاکبازی، حلم، ترک لایعنی، توکل، خشیت اور تقویٰ صبر سے متعلق ہیں۔ احکام شریعت میں اوامر سے شکر کو زیادہ نسبت ہے اور نواہی سے صبر کو"۔[4]

---

[1] تفسیر سورہ والعصر ص ۳۵۶، [2] ایضاً ص ۳۴۵-۳۴۶، ۳۵۵-۳۵۷، دلائل النظام ص ۴۷-۴۹، ۱۳۷، مفردات القرآن، فی ملکوت اللہ ص ۴۱-۴۳، [3] دلائل النظام ص ۴۸، [4] ایضاً ص ۴۸

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شکر اور صبر تمام شرائع اور اچھی خصلتوں کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہیں۔ شکر اور صبر کے بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ:

"ہر واقعہ وحادثہ یا تو آپ کو صبر کی دعوت دیتا ہے یا شکر کی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ان فی ذلك لآیات لکل صبار شکور"[1]

بعض اعتبار سے صبر کو شکر پر تقدم حاصل ہے اور بعض اعتبار سے شکر کو صبر پر۔ شکر کی فضیلت یہ ہے کہ شکر سے اطاعت کی توفیق اور ہدایت ملتی ہے اور صبر سے اس پر ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے[2] نیز یہ کہ جس طرح ایمان کو عمل پر اولیت حاصل ہے اسی طرح شکر کو صبر پر ہے کیونکہ شکر وہ کیفیت ہے جو نعمتوں کے احساس وشعور سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اولین عبودیت شکر ہی ہے، وجوباً اور زماناً دونوں لحاظ سے[3]۔ شکر کا تعلق ماضی وحال سے ہے اور صبر کا حال اور مستقبل سے[4]۔

صبر کی اولیت کے پہلو یہ ہیں: صبر ایک طرح سے شکر کے لیے بنیاد کا کام کرتا ہے[5]۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تقویٰ جو صبر سے تعلق رکھنے والی صفت ہے اگر اس سے قلب کی صفائی نہ ہو تو شکر کا احساس بھی نہ رہ جائے کیونکہ غیر متقی شخص شکر کے احساس سے محروم ہوتا ہے[6]۔ دوسرے یہ کہ شکر کو صبر کی احتیاج ہوتی ہے، کیونکہ بندہ کو آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ اس جزا کے انتظار میں رہتا ہے جس کا آخرت میں واقع ہونا عین حق وانصاف ہے۔ یہی صبر کا شکر کی بنیاد ہونا ہے۔ اسی لیے "صبار شکور" کے الفاظ آئے ہیں[7]۔ اس طرح صبر کے علیٰحدہ محاسن مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً یہ صبر کی خوبی ہے کہ وہ نفس کو ہمیشہ تقویٰ پر ثابت وقائم رکھتا ہے، وعدۂ الٰہی کے انتظار میں استقامت بخشتا ہے، عقل کو جلد بازی سے روکتا ہے، ایک داعی اور مصلح کو منکرین سے دل برداشتہ نہیں ہونے دیتا اور ان کی ایذارسانیوں کو انگیز کرنے کی قوت دیتا ہے[8]۔

گرچہ شکر کے قیام واستحکام کے لیے صبر ایک امر ضروری ہے، لیکن جس طرح اعمال صالحہ سے

---

[1] سورہ ابراہیم ۵، دلائل النظام ص ۴۸، [2] ایضاً ص ۴۹، [3] ملاحظہ ہو مفردات القرآن "الصبر والشکر"۔ اپنے تفسیر حواشی میں مولانا فرماتے ہیں: "وھو اول الواجبات واول المعارف وھو ایفاء العھد الاول الذی ھو الاقرار بالربوبیة ولھذا ذکر ھذا الوصف اولاً" (سورہ فاتحہ)۔ [4] دلائل النظام ص ۴۹
[5] مفردات القرآن، [6] دلائل النظام ص ۴۸-۴۹، [7] مفردات القرآن، [8] دلائل النظام، ص ۴۶

پہلے ایمان ضروری ہے اسی طرح شکر کو بھی صبر پر فضیلت اور اولیت حاصل ہے۔ چنانچہ شکر ہر عمل صالح سے پہلے ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا[2] اعمال صالحہ سے پہلے شکر کے وجود کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ تمام اعمال صالحہ رب کی اطاعت اور اس کی رضا کے لیے قوتوں کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں اور یہی شکر ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا، اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا[3]

ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے پانی کی ایک بوند سے۔ اسی کو الٹتے پلٹتے رہے یہاں تک کہ ہم نے اسے دیکھنے سننے والا بنا دیا۔ ہم نے اس کو راہ سجھا دی، چاہے شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ عدل تمام حقوق کی بنیاد ہے اور پہلا حق بندگی اور رب کے لیے سرفگندگی ہے۔ یہ حق کے وجوب کے لحاظ سے ہے۔ رہا حق کے وجود کا پہلو تو پہلا حق شکر ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلا فیضان اس کی رحمت ہے جو ہماری جانب سے اس کے شکر کو لازم ٹھہراتی ہے۔ چنانچہ رحمت کے ساتھ شکر کا لزوم عدل وقسط پر اس کے مبنی ہونے کی دلیل ہے، اور یہی حق ہے جو باطل کی ضد ہے۔ یہ شکر کی جامعیت کا پہلو ہے اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے شکر صبر کا معاون اور مددگار ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا عرفان جس کو حاصل ہوتا ہے وہ مشکلات وشدائد پر اس کی رضا کے لیے صبر کرنے والا بن جاتا ہے۔ آیت وآخر دعواھم أن الحمد للہ رب العلمین[4] سے اس حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے[5]۔

مولانا نے صبر اور شکر کی حقیقت اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنے کے لیے سورہ فاتحہ کی آیت "ایاك نعبد وایاك نستعین" پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس میں "ایاك نعبد" کا ٹکڑا جو اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کو ظاہر کرتا ہے اس کے متعلق فرماتے

---

[1] مفردات القرآن، [2] فصلت ۳۰، الاحقاف ۱۳، [3] سورۃ الانسان ۲-۳
[4]، [5] یہ بحث مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔

ہیں کہ یہی شکر ہے[1] اور دوسرا ٹکڑا " ایاك نستعین "، جو کہ توکل کا مقام ہے اسے انھوں نے صبر سے زیادہ متعلق بتایا ہے[2]۔

اب سورۂ اعراف میں ابلیس کی زبانی جو حکایت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی اُس پر غور کیجئے:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ	میں ضرور بیٹھوں گا ان کی گھات میں
الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	تیری سیدھی راہ پر۔ پھر ان پر حملہ آور
مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ	ہوں گا ان کے آگے سے اور پیچھے سے
خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ	اور دائیں سے اور بائیں سے۔ اور تو
وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ	نہیں پائے گا ان میں سے اکثر کو اپنا
اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ[3]	شکر گذار۔

پس ثابت ہوا کہ شکر ہی حقیقی ایمان ہے[4] یعنی وہ ایمان جس میں عمل صالح اور اس پر ثابت قدمی یا اس کا استحکام بطور لزوم کے شامل ہے کیوں کہ آیت مذکورہ کی دلالت اسی بات پر ہے۔

---

[1] مفردات القرآن، [2] ایضاً [3] ۱۶-۱۷، [4] مفردات القرآن